سیاست وامارت

حافظ حمزہ الزیادمدنی

بیعت لینے کا جواز کس کے لئے؟

بیعت دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ایک سودے اور معاہدے کا نام ہے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی جان اور مال قربان کرنے کا عہد کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے بدلے میں جنت دینے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ بیعت کے اس مفہوم کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (التوبہ:۱۱۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمن بندوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ مؤمن بندے اللہ کے رستے میں قتال کرتے ہیں، پس وہ (کافروں کو) قتل کرتے بھی ہیں اور (خود بھی) شہید ہوتے ہیں۔ سچا وعدہ ہے اللہ کے ذمے جو تورات، انجیل اور قرآن میں موجود ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے۔ تم اپنے اس سودے (بیعت) پر خوشخبری حاصل کرو جو کہ تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

یہ آیتِ مبارکہ بیعتِ عقبہ ثانیہ (جسے بیعتِ کبریٰ بھی کہتے ہیں) کے بارے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"ونزلت الآية في البيعة الثانية وهي بيعة العقبة الكبرٰى"

''یہ آیتِ مبارکہ بیعت عقبہ ثانیہ (وهي بيعة كبرىٰ) کے بارے میں نازل ہوئی۔''

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں سے براہِ راست ایک معاہدہ کر رہے ہیں اور معاہدے کے وقت فریقین معاہدہ کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے

بندوں کے درمیان اس معاہدے کے وقت اہل ایمان تو خود موجود ہوتے ہیں جبکہ اللہ کی طرف سے اس کا نمائندہ یعنی نبی ﷺ اس معاہدے میں بالفعل شریک ہوتے ہیں۔

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں سے یہ معاہدہ کر رہے ہیں کہ اگر وہ اس کے رستے میں اپنی جان اور مال خرچ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو بدلے میں جنت دیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا تعین کون کرے گا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے جس میں اس کے مؤمن بندوں کو اپنی جان اور مال کھپانا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت اس بات کا تعین نبی ﷺ ہی کر سکتے تھے، اس لیے کہ بیعت یوں تو بظاہر نبی کریمؐ سے ہوتی ہے لیکن معاہدۂ بیعت میں نبی ﷺ فریق معاہدہ نہیں ہوتے بلکہ معاہدے کے فریقین اللہ تعالیٰ یا عام اہل ایمان ہوتے ہیں جبکہ نبی ﷺ اللہ کی طرف سے ایک نمائندہ بن کر یہ معاہدہ کرتے ہیں اور ایک بندہ مؤمن کے لیے اس مقام کو متعین کرتے ہیں جہاں اس نے اپنی جان اور مال و دولت کو کھپانا ہے۔ اسی بات کو قرآن نے ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾ (الفتح:۱۰)

''بلا شبہ جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پس جس نے (اپنا معاہدہ) توڑ دیا تو اس کے توڑنے کا وبال اسی پر ہوگا اور جو کوئی اللہ سے کیے گئے معاہدے کو پورا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو عنقریب اس کا بہت بڑا اجر دیں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے نہ کہ نبی ﷺ سے۔ اور جو بیعت کو توڑتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے کیے گئے ایک معاہدے کو توڑتا ہے اور جو بیعت کو پورا کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے ایک معاہدے کو پورا کرتا ہے۔

بیعت اللہ ہی کی کیوں ہوتی ہے؟

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جو اوپر والی بحث کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے کہ بیعت

اللہ ہی کی کیوں ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کی کیوں نہیں ہوتی ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ بیعت ایک قسم کا سودا ہے اور وہ یہ کہ اگر مؤمن اپنی جان اور مال اللہ کی راہ میں کھپا دیں تو اللہ تعالیٰ ان کو بدلے میں جنت دے گا۔اب نبی ﷺ اللہ کی مرضی کے بغیر اپنی طرف سے کسی اُمتی سے یہ وعدہ نہیں کر سکتے کہ تم اگر یہ کام کرو گے تو میں تمہیں جنت دوں گا کیونکہ کسی کو جنت دینا یا آخرت میں فوز و فلاح سے ہم کنار کرنا اللہ کے اختیار میں ہی ہے۔جب بیعت جان و مال کے بدلے میں جنت کے سودے کا نام ہے تو یہ بیعت صرف اللہ کی ذات ہی سے ہوسکتی ہے جو کہ جنت کا مالک ہے۔لیکن نبی چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے، اس لیے وہ اللہ کی طرف سے بیعت لیتا ہے۔خود اپنی طرف سے نبی جنت یا جہنم کا سودا نہیں کر سکتا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (آل عمران: ۱۲۸)

بلکہ نبی کریم ﷺ نے کافر اور فاسق کے فتویٰ کے باوجود وحی کی نص کے بغیر کسی متعین شخص کو جہنمی یا جنتی کہنے سے منع کیا ہے۔مذکورہ بالا سورہ توبہ کی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے سودا کرتے وقت جان کا ذکر پہلے کیا ہے اور مال کا بعد میں، حالانکہ قرآن کا عام اُسلوب یہ ہے کہ مال کا ذکر پہلے ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سے کیے گئے اس معاہدے میں اصل معاہدہ اللہ کے رستے میں جان قربان کرنے کا ہے۔اب بندوں نے اپنی جان کہاں کھپانی ہے یا اس سے بڑھ کر جان کہاں قربان کرنی ہے، اس کا تعین اللہ ہی کر سکتا ہے اور نبی چونکہ اللہ کا براہِ راست نمائندہ ہوتا ہے، اس لیے جان و مال کو اللہ کے رستے میں کھپانے کے لیے نبی ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت ہوتی ہے۔

اُمت کے اعتبار سے آپ ﷺ کی زندگی کے دو پہلو نمایاں ہیں: ایک آپؐ کی زندگی بطورِ نبیؐ کے اور دوسرا آپؐ اُمت مسلمہ کے پہلے منتظم یعنی حکمران بھی ہیں۔ جب نبی ﷺ کی وفات ہوگئی تو نبی ﷺ کی نبوت چونکہ عالمگیر اور تا قیامت دائمی تھی، اس لیے نبوت میں تو نیابت کا کوئی سلسلہ جاری نہ ہوا جبکہ آپؐ کی حکمرانی عارضی تھی، لہٰذا آپؐ کی وفات کے فوراً بعد

مسلمانوں میں حکمران کا خلا پیدا ہوگیا۔ اسلئے مسلمانوں کے معتمد خلیفۃ الرسول ﷺ نے آپؐ کے حکمرانی میں نائبِ رسولؐ کی حیثیت سے اُمتِ مسلمہ کے منتظم کی ذمہ داری سنبھالی۔

آپ ﷺ کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ چنانچہ وہی بیعت جو اللہ تعالیٰ سے اس کے براہِ راست نمائندے یعنی نبی ﷺ کے واسطے سے ہوتی تھی، اب اللہ کے نمائندے ﷺ کے نائب☆ یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ذریعے سے ہونے لگی۔ یہ نیابت یا خلافت حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو منتقل ہوگئی۔ اب حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے نائب یا خلیفہ کی حیثیت سے بیعت لینے لگ گئے۔ حضرت عمرؓ کو ابتدا میں خلیفة خلیفة رسول الله کہا جاتا◉ تھا، پھر بعد میں طوالت سے بچنے کے لیے اُنہوں نے أمیر المؤمنین کا لقب اختیار کرلیا۔ اسی طرح یہ خلافت چلتی رہی اور خلفاے اربعہ کے بعد بنو اُمیہ اور بنو عباس کے حکمران اہل ایمان سے سمع و طاعت کی بیعت لیتے رہے۔ مسلمان حکمرانوں کی یہ بیعت بھی درحقیقت اللہ ہی سے ہوتی تھی لیکن نبی ﷺ کے نائب کے حوالے سے ہوتی تھی کیونکہ مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت اللہ کے نبی ﷺ کے نائب کی ہوتی ہے۔ اس لیے عام اہل ایمان اپنے حکمرانوں کی معروف میں سمع و طاعت کی بیعت کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ سے اپنے سودے کے مطابق جنت کی اُمید رکھتے ہیں۔

ایک سے زائد افراد کی بیعت کا مسئلہ

چونکہ کسی بھی ذات کا اصل نائب ایک ہی ہوتا ہے، اس لیے اگر ایک سے زائد افراد بیعت کا دعویٰ کر دیں تو گویا وہ سب نبی کریمؐ کے نائب ہونے کے داعی ہیں اور ان میں ہر ایک اس بات کا مدعی ہے کہ اس کی سمع و طاعت کے بدلے میں اللہ کی طرف سے جنت ملے گی۔ اس لیے اگر ایک ہی علاقے اور سرزمین میں ایک سے زائد افراد بیعت لینے کے مدعی

☆ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت ابو بکرؓ صدیق کو خلیفة الله کہہ کر پکارا تو آپ نے اپنے خلیفة الله (اللہ کا خلیفہ) ہونے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا: لست خلیفة الله بل أنا خلیفة رسول الله ﷺ (تفسیر قرطبی، طبقات ابن سعد، کنز العمال: ح ۱۴۰۴۸)

◉ تفسیر آلوسی: ۳۳۴/۱۷..... زیر آیت سورۃ ص: ۲۶

ہوں گے تو جس کی بیعت پہلے ہو چکی ہوگی، اس کی بیعت کو برقرار رکھا جائے گا اور بعد میں دعویٰ کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ جب مسلمانوں کے ایک ہی علاقے میں ایک سے زائد افراد نبی اکرم ﷺ کے نائب یا خلیفہ ہونے کا دعویٰ کریں گے تو اہل ایمان میں باہمی قتل وغارت گری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آپ کا ارشاد ہے:

«إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما»

(صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب إذا بویع لخلیفتین، ح ۱۸۵۳)

''جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو جو اُن میں سے متاخر ہے، اس کو قتل کر دو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت صرف اس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کا نائب ہو اور کسی علاقے ☆ میں اللہ کے رسول کا نائب أمیر المؤمنین یا مسلمانوں کا حکمران ہوتا ہے اور أمیر المؤمنین یا حکمران ایک علاقے میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر حکمران کے علاوہ کسی کی بیعت جائز ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ دوسرے خلیفہ کے قتل کا حکم نہ دیتے۔ کیونکہ اصلاً حکمران تو پہلا ہی خلیفہ ہے جبکہ دوسرے نے تو ابھی خلافت کا دعویٰ ہی کیا ہے اور اس کے لیے بیعت لینا شروع کی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو۔

ثابت ہوا کہ بیعت، سمع و طاعت صرف حکمران کے لیے ہے، اگر تو یہ حکمران عام اہل ایمان کو اللہ کے رستے میں کسی جگہ اپنا جان و مال خرچ کرنے کا حکم دے تو اس کی سمع و طاعت اس معاملے میں واجب ہے اور اس کے بدلے میں اللہ کی طرف سے جنت کی اُمید رکھنی چاہیے۔ آپ کا فرمان ہے:

«وإذا رأيتم من ولاتكم شيئًا تكرهونه فاكرهوا عمله ولا تنزعوا يدًا من طاعة» (صحیح مسلم، ح ۱۸۵۵)

''جب تم اپنے حکمرانوں میں کوئی ناپسندیدہ اَعمال دیکھو تو ان کے ان اعمال کو ناپسند ہی جانو لیکن ان کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔''

☆ کیا مسلمانوں کی الجماعۃ ایک سے زیادہ اور مختلف علاقوں میں ایک سے زیادہ خلیفے ہو سکتے ہیں یا رسول اللہ کے انتظامی نائب ہونے کی حیثیت سے خلیفہ تو ایک ہی ہوتا ہے اور باقی اس سے منسلک ہوتے ہیں؟ یہ مسئلہ مستقل طور پر تفصیل طلب ہے جس پر کتب فقہ میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

البتہ اگر مسلمانوں کا کوئی حکمران ان کو کسی ایسی جگہ جان و مال کھپانے کا حکم دے جہاں اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آتی ہو تو اس معاملے میں حکمران کی سمع و طاعت نہیں ہوگی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«على المرء المسلم السمع والطاعة فيما أَحَبَّ وكَرِهَ إلا أن يؤمر بمعصية فإن أمر بمعصية فلا سمع وطاعة» (صحیح مسلم: ح۱۸۳۹)

''ایک مسلمان پر سمع و طاعت ہر معاملے میں لازمی ہے چاہے وہ اسے پسند ہو یا نہ۔ الا یہ کہ اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے۔ پس اگر کسی مسلمان کو اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر اس پر (حکمران کی) سمع و طاعت واجب نہیں رہتی۔''

معلوم ہوا کہ حکمران کے لیے سمع وطاعت کی بیعت مطلق نہیں ہوتی بلکہ یہ سمع و طاعت معروف (دین وشریعت) کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔

☜ اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ

① معاہدہ بیعت اللہ اور اس کے بندوں کے مابین نبی کریم ﷺ کے توسط سے ہوتا ہے۔

② بعد میں یہ معاہدۂ بیعت نبی کے بطورِ حکمران نائب کی حیثیت سے الجماعة کے امیر یعنی حکمران سے ہوتا ہے۔

③ ایک علاقے میں ایک ہی امیر کی بیعت کی جاسکتی ہے، بعد میں بیعت لینے والے دوسرے امیر کو قتل کردینا چاہئے۔

④ امیر اگر بعض کام غلط بھی کرے تو ان باتوں کو غلط سمجھنے کے باوجود اس کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنا جائز نہیں البتہ معصیت کے کاموں میں خود امیر کی اطاعت کرنا درست نہیں۔

مذکورہ بالا احکام تو الجماعة کے حوالے سے ہیں، البتہ کیا مسلمانوں میں اس کے علاوہ کوئی نظم قائم نہیں کیا جاسکتا اور الجماعة، ایک عام جماعت یا انجمن میں کیا فرق ہے؟ یہ موضوع ابھی وضاحت طلب ہے۔

احادیث میں الجماعة سے مسلمانوں کا نظم اجتماعی ہی مراد ہے!

اَحادیث میں مسلمانوں کو التزامِ جماعت کا جو حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد کوئی محدود

جماعت یا انجمن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ملتِ اسلامیہ یا مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم ہے۔ کیونکہ جن احادیث میں بھی التزامِ جماعت کا حکم بیان ہوا ہے، ان میں الجماعة یا جماعة المسلمین کے الفاظ سے یہ حکم بیان ہوا ہے۔اور الجماعة ہو یا جماعة المسلمین دونوں ہی عربی گرامر کی رو سے معرفہ ہیں اور ان سے مراد اُمتِ مسلمہ (ملت اسلامیہ) یا مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم ہے نہ کہ مسلمانوں کی کوئی محدود جماعت یا انجمن۔مثلاً آپ کا ارشاد ہے:

① «يد الله على الجماعة» (صحیح الجامع الصغیر:۸۰۶۵)

''الجماعة پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

اس حدیث میں الجماعة کا لفظ بیان ہوا ہے جس سے مراد ایک خاص جماعت یعنی اُمتِ مسلمہ یا مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم ہے، اسی طرح ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

② «وأنا آمركم بخمس، الله أمرني بهن: السمع والطاعة والجهاد والهجرة والجماعة فإنه من فارق الجماعة قيد شبر فقد خلع ربقة الإسلام من عنقه إلا أن يراجع» (سنن ترمذی: ح۲۸۶۳)

''اور میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: سمع و طاعت، جہاد و ہجرت اور جماعت کا۔ بے شک جو الجماعة سے بالشت برابر بھی دور ہوگیا، اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار دیا سوائے اس کے وہ دوبارہ اس کی طرف رجوع کرلے۔''

اس حدیث میں بھی الجماعة کا لفظ بیان ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس الجماعة سے علیحدگی کو اسلام سے علیحدگی کے مترادف قرار دیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں لجماعة سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم ہے نہ کہ کوئی محدود جماعت یا انجمن۔

③ ایک اور حدیث میں الفاظ اس طرح ہیں:

«تلزم جماعة المسلمين وإمامهم» (صحیح بخاری: ح۳۳۳۸)

''تو لازم پکڑ و مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کو۔''

اس حدیث سے بھی کوئی محدود و رجسٹرڈ 'جماعت المسلمین' یا اس کا امام مراد نہیں ہے بلکہ ں سے عام مسلمانوں کی جماعت یعنی اُمتِ مسلمہ اور ان کا امام مراد ہے۔

④ ایک اور روایت میں آپ کا ارشاد ہے:

«من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية» (مسلم:۱۸۴۸)

اس حدیث میں من خرج من الطاعة اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں بھی الجماعة سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم ہے اور الجماعة سے نکلنے سے مراد اس اجتماعی نظم کے خلاف، بغاوت یا خروج کرنا ہے۔

الجماعة اور ایک محدود تنظیم/انجمن کا نظم

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ احادیث مبارکہ میں جو نظم جماعت بیان ہوا ہے وہ الجماعة یا جماعة المسلمین کا نظم ہے اور اس نظم کو اگر ہم دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اس کے لیے حدیث ہی کی اصطلاح 'سمع و طاعت' ہے یعنی عام مسلمان اپنے امیر کی بات سنیں گے اور پھر اس کی اطاعت کریں گے۔ مسلمانوں کے امیر کی یہ سمع و طاعت سوائے اللہ کی معصیت یا نافرمانی کے کاموں کے ہر معاملے میں ہوگی، چاہے مامورین اسے پسند کریں یا ناپسند۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«ولو استعمل عليكم عبد يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له وأطيعوا»

''اگر تمہارے اوپر کوئی غلام بھی حکمران بنا دیا جائے جو کتاب اللہ سے تمہاری رہنمائی کرے تو تم اس کی سمع و طاعت کرو۔'' (صحیح مسلم: ح ۱۸۳۷)

قرآن و سنت نے ہمیں الجماعة کے التزام کا حکم دیا ہے جس سے مراد اُمت مسلمہ ہے یا مسلمانوں کا سیاسی اجتماعی نظم ہے اور اسی الجماعة کے التزام کو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت مسلم معاشروں میں الجماعة کے علاوہ بھی بہت سی محدود مذہبی جماعتیں یا انجمنیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک ان محدود جماعتوں یا انجمنوں کے قائم کرنے کا مسئلہ ہے تو حالات کے تحت ان جماعتوں کے بنانے اور ان کے التزام کا حکم بھی مختلف ہوگا۔

الجماعة کے امام کی نااہلی کی صورتیں

اس وقت مسلمانوں کی الجماعة تو موجود ہے لیکن اس الجماعة کا مطلوب امام موجود

نہیں ہے کیونکہ جو اس وقت مسلمانوں کے نام نہاد عام حکمران موجود ہیں وہ امامت کی بنیادی اہلیت پر پورا نہیں اُترتے۔ آپ کا ارشاد ہے:

① «خيار أئمتكم الذين تحبونهم ويحبونكم ويصلون عليكم ويصلون عليهم وشرار أئمتكم الذين تبغضونهم ويبغضونكم وتلعنونهم ويلعنونكم». قيل يا رسول الله! أفلا ننابذهم بالسيف؟ فقال: «لا. ما أقاموا فيكم الصلاة» (صحیح مسلم: ح۱۸۵۵)

''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے، تم ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے۔ اور تمہارے بدترین حکمرن وہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتے ہیں، تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر۔ کہا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم ان کو تلوار سے ہٹا نہ دیں تو آپ نے فرمایا: تمہیں ایسا کرنے کی اس وقت تک اجازت نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز کا نظم قائم کرتے رہیں۔''

یہ حدیث اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اگر حکمران خود نماز کا پابند نہ ہو یا مسلمانوں میں نماز کا نظم قائم نہ کرے تو مسلمانوں کی امامت کا اہل نہیں ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس امام کو معزول کردیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:

② أجمع العلماء على أن الإمامة لاتنعقد للكافر وعلى أنه طرأ عليه الكفر انعزل قال وكذا لو ترك إقامة الصلوات و الدعاء اليه

(شرح نووی: ۳۱۴/۶)

''مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ کافر کبھی مسلمانوں کا امام (حکمران) نہیں بن سکتا اور اگر کوئی مسلمان امام کافر ہو جائے تو وہ امامت سے معزول ہو جائے گا اور اسی طرح اگر وہ نماز قائم کرنا اور اس کی طرف لوگوں کو بلانا چھوڑ دے تو پھر بھی معزول ہو جائے گا۔''

③ ایک دوسری روایت میں ایسے امام کے لیے جو امامت کا اہل نہیں ہے، 'کفر بواح' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں:

فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا وأثرة علينا وأن لا ننازع الأمر أهله «إلا أن تروا كفرا

بو احا عندكم من الله فيه برهان» (صحیح مسلم: ح۱۷۰۹)

''ہم سے جو معاہدۂ بیعت لیا گیا، ان اُمور میں ایک یہ تھا کہ ہم نے ہر حال میں سمع وطاعت کی بیعت کرنا ہے ہم پسند کریں یا ناپسند، تنگی میں رہیں یا آسانی میں۔ چاہیے ہمارے اُوپر کسی دوسرے کو ترجیح دی جائے۔ اور ہم نے اس بات پر بھی بیعت کی کہ ہم اپنے امرا سے جھگڑا نہیں کریں گے، سوائے اس کے کوئی امیر صریح کفر کا مرتکب ہو، اس کے کفر پر کوئی واضح دلیل ہمارے پاس موجود ہو جسے ہم اللہ کے ہاں پیش کرسکیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی حکمران دین اسلام کی بنیادی تعلیمات (جنہیں ضروریاتِ دین کہتے ہیں) میں سے قرآن وسنت میں موجود کسی ایسی صریح یا واضح تعلیم کا انکار کر دے کہ جس میں مناسب تاویل کی گنجائش موجود نہ ہو تو وہ مسلمانوں کی امامت کا اہل نہیں رہتا۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:

فلو طرأ عليه الكفر وتغير الشرع أو بدعة خرج عن حكم الولاية وسقطت طاعته ووجب على المسلمين القيام عليه وخلعه ونصب إمام عادل إن أمكنهم ذلك (شرح نووی صحیح مسلم:۳۱۴/۶)

''پس اگر حکمران کافر ہو جائے یا شریعت کو تبدیل کر دے یا کسی بدعت کا مرتکب ہو تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی سے محروم ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کی اطاعت باقی نہیں رہتی بلکہ مسلمانوں پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکمران کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کو معزول کر کے اس کی جگہ ایک عادل امام (حکمران) کو لے کر آئیں بشرطیکہ وہ ایسا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔''

شرعاً موزوں امام کے حصول کے لئے جدوجہد

لہٰذا مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنا کوئی ایسا امام مقرر کریں جو امامت کی بنیادی شرائط پر پورا اُترتا ہو۔ اگر اس امام کے تقرر کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے تو تنظیم بھی بنائی جاسکتی ہے۔ اس غرض سے تنظیم بنانے اور اس میں شمولیت کا حکم فرضِ کفایہ کا ہوگا کیونکہ اگر امام کی تقرری کسی اجتماعی جدوجہد کے بغیر ممکن ہی نہ ہو تو پھر اس جماعت کا بنانا فقہی اُصول مالا يتم الواجب إلا به فهو واجب کے تحت فرضِ کفایہ ہوگا اور ایسی جماعت

سے تعاون کا حکم بھی وجوبِ کفایہ کے درجے میں ہوگا تاکہ اس محدود و عارضی تنظیم کی جدوجہد کے نتیجے میں جماعت المسلمین کا ایسا امام مقرر ہو سکے جو امامت کی شرائط پر پورا اُترتا ہو اور جب اُمتِ مسلمہ اس کی قیادت پر مطمئن ہو جائے تو یہ امامت کبریٰ کا مقام حاصل کر لے گی۔ تب اس امام کی بیعتِ سمع وطاعت بھی ہوگی تاکہ اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان تلزم جماعة المسلمین وإمامهم پر عمل ہو سکے۔

☜ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ تمدنی ارتقا کے نتیجہ میں جدید معاشروں میں کچھ ایسی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں جن کے نتیجے میں عصر حاضر میں امام کا مقام انفرادی کی بجائے ایک سیاسی اجتماعیت کو دے دیا گیا ہے جسے 'ریاست' کہتے ہیں۔اس عرف کی شرعی حیثیت سے قطع نظر ریاست کے نظم ونسق کی اساس آئین ودستور کو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی کسی ملک کا صدر یا وزیراعظم عارضی ہوتا ہے اور وہ نظم ونسق کے لیے ریاست کے آئین ہی کا پابند ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی ریاست کا آئین یا دستور دین وشریعت سے آزاد ہوگا تو فرد کی بجائے ریاست غیر اسلامی ہوگی اور اس کے خلاف خروج جائز ہوگا۔ البتہ اگر کسی ریاست کا آئین و دستور اسلامی ہوگا تو وہ ریاست اسلامی کہلائے گی اور اس کے خلاف خروج یا مسلح بغاوت جائز نہیں ہوگی۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی ریاست کا دستور و آئین تو اسلامی ہو لیکن اس کے حکمران کافر کی بجائے فاسق و فاجر ہوں تو ایسی صورت میں ان حکمرانوں کو ہٹانے کی جدوجہد آئینی طریقہ سے کی جائے گی تاکہ عادل و منصف حکمران برسر اقتدار آئیں اور اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق بنائے گئے آئین کی روشنی میں ریاست کے داخلی و خارجی معاملات کو چلائیں۔

☜ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امامتِ کبریٰ کے قیام کی غرض سے یا کسی چھوٹی سطح پر سماجی بہبود یا فکری اصلاح کے مقاصد سے جو ادارے، انجمنیں یا اسی طرح کی دیگر تنظیمیں محدود مقاصد کے لیے بنائی جاتی ہیں، ان کا نظم ونسق کیا اُسی انداز کا ہوگا جو احادیث میں الجماعة کا نظم بیان ہوا ہے۔اس مسئلے کی کافی تفصیل ہے اور علمائے اسلام کی آرا بھی مختلف

ہیں۔ جو لوگ امامتِ کبریٰ ہو یا صغریٰ کے لیے شرع میں اُصولی تعلیمات اور طریق کار کی پابندی کے قائل ہیں، وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر نظم کا اساسی نظام شریعت نے ایک ہی رکھا ہے لہٰذا ان اُصولوں اور مناہج کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ البتہ جہاں امامتِ صغریٰ یا کبریٰ کا معاملہ نہ ہو بلکہ فکری، علمی اور رفاہی قسم کی سماجی انجمنیں تشکیل دیتے ہوئے اگر بعض جدید تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے معاملات کو وقتی طور پر انجام دینے کے لیے جدید نظاموں سے کچھ طریقے لے لیے جائیں تو ہماری رائے میں اس پر زیادہ سخت رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ دراصل یہ بحث 'مصالح مرسلہ' کی ہے۔ اس ضمن میں 'مصالح مرسلہ' کے بارے میں فقہاے اسلام کے اختلافی نقطہ ہاے نظر کے مطابق کسی وقت مناسب بحث پیش کی جاسکتی ہے۔ اِن شاء اللہ..... تاہم امامتِ کبریٰ میں تلزم جماعة المسلمين وإمامهم کے تحت شرعی نظم کے وجوب پر علماے اسلام متفق ہیں۔

ہم اس وقت امارتِ صغریٰ کے اختلافی شرعی نظام کی بحث چھوڑتے ہوئے صرف ایک مسئلہ پر کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ نظام کچھ بھی ہو، پہلی بات یہ ہے کہ محدود جماعت یا انجمن کے امیر کی سمع و طاعت تو ہوگی جیسا کہ نماز کے امام کی اقتدا ہوتی ہے جو محدود جماعت کا امام بھی ہوتا ہے اور اس کی سمع واطاعت بھی ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کوئی عارضی جماعت یا انجمن اپنی رکنیت کے لیے بیعت کے بغیر حلف نامہ یا معاہدہ کے ذریعے اپنے ارکان کو پابند بنا سکتی ہے کہ وہ اس جماعت یا انجمن کے امیر کی سمع و طاعت ہر صورت کریں گے۔ کسی بھی نظم کی پابندی ہر تنظیم میں ہوتی ہی ہے اور شریعت کی رو سے کسی بھی جماعت یا ادارہ سے ایسا معاہدہ اس وقت تک جائز ہے جب تک کہ اس سے کسی معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ البتہ یہ چیز ملحوظ رکھی جائے کہ سمع وطاعت کا معاہدہ افراد کے لیے الگ ہوتا ہے اور اداروں کے لیے الگ۔ اداروں کی انجمنیں دستور وضوابط وضع کر کے اپنے ارکان اور عہدہ داران کے لیے ضوابط بنا لیتی ہیں پھر افراد کے بجائے سب کے لیے ان ضوابط کی پابندی ہوتی ہے۔

بیعت اور نظم جماعت میں فرق

نظم جماعت اور بیعت میں فرق ہے مثلاً الجماعۃ کا نظم جماعت تو امیر کی 'سمع وطاعت' ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے لیکن نبی ﷺ یا ان کا نائب (خلیفہ) اس نظم جماعت کی پابندی کروانے کے لیے اپنے مامورین سے ایک خاص طریقے سے جو وعدہ لیتا ہے، وہ بیعت کہلاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاہدات اور بیعت میں بھی فرق ہے، ایک عام معاہدہ تو کوئی مسلمان کسی سے کسی وقت بھی کر سکتا ہے جب تک کہ وہ قرآن وسنت کے منافی نہ ہو یا اس سے مسلمانوں کے امام سے کیے گئے وعدے یعنی بیعت کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو، لیکن معاہدۂ بیعت ذاتی قسم کے تمام باہمی معاہدات سے بلند تر جان و مال کے سودے کی صورت ہوتی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے:

فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعُسرنا ويُسرنا وأثرة علينا وأن لا ننازع الأمر أهله إلا أن تروا كفرًا بواحا عندكم من الله فيه برهان (صحیح مسلم:۱۷۰۹)

''ہم سے جو معاہدے لیے گئے، ان میں ایک یہ تھا کہ ہم نے ہر حال میں سمع و طاعت کی بیعت کی، چاہے ہم پسند کریں یا ناپسند؛ تنگی میں ہوں یا آسانی میں، چاہے ہمارے اوپر کسی دوسرے کو ترجیح دی جائے، اور ہم نے اس بات پر بیعت کی کہ ہم اپنے اُمرا سے جھگڑا نہیں کریں گے سوائے اس کے کوئی امیر صریح کفر کا مرتکب ہو اور اس کے کفر پر کوئی واضح دلیل ہمارے پاس موجود ہو جسے ہم اللہ کے ہاں پیش کرسکیں۔''

اس روایت میں الجماعۃ کا جو نظم بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خوشی ہو یا ناراضگی' تنگی ہو یا آسانی' ہر حال میں امیر کی اطاعت کی جائے گی اور اس سے کسی معاملے میں بھی جھگڑا نہیں کیا جائے گا۔ یہ نظم جماعت جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں الجماعۃ کے علاوہ کسی محدود جماعت یا انجمن کے لیے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس نظم پر عمل پیرا ہونے کے لیے اللہ کے نبی ﷺ یا ان کے خلفا نے جو بیعت لی ہے، وہ بیعت کسی محدود جماعت کا امیر یا انجمن کا صدر نہیں لے سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعت صرف الجماعۃ کے امام کے لیے خاص ہے

یا وہ شخص لے سکتا ہے جو کسی خاص علاقے میں الجماعۃ کے امام ہونے کا دعویٰ کرے جیسا کہ حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، سید احمد شہید بریلویؒ اور ملا محمد عمر نے بیعت لی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امامتِ صغریٰ مثلاً نماز کا امام یا کسی عارضی و محدود جماعت مثلاً سفری جماعت کے امیر کے لیے احادیث میں سمع و طاعت کا ذکر تو ملتا ہے لیکن ایسے امام یا امیر کے لیے بیعت ثابت نہیں ہے۔ مثلاً سفر کی حالت میں جو جماعت بنتی ہے، اس کے امیر کی سمع و طاعت تو ہوتی ہے لیکن بیعت نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز کا جو امام ہوتا ہے، اس کی اقتدا تو ہوتی ہے لیکن بیعت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ عصر حاضر میں کسی بھی ادارے میں ملازمت کرنے والا فرد ایک معاہدۂ ملازمت پر عمل درآمد کرتے ہوئے اپنے افسر (Boss) کی سمع و طاعت تو کرتا ہے، لیکن اس کی بیعت نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر محدود مقاصد کے لیے بننے والی جماعتوں اور انجمنوں کے اُمرا بھی بیعت لینا شروع کر دیں گے تو پھر اسلامی معاشرے میں بہت سی ایسی جماعتیں وجود پذیر ہوں گی کہ جن کے اراکین اپنے امرا سے بذریعہ بیعت یہ معاہدہ کر رہے ہوں گے کہ وقت آنے پر وہ اپنے امیر کے حکم پر اپنی جان اور مال قربان کریں گے اور ان کے اُمرا جواباً ان کو سورۃ توبہ کی آیات سنا کر جنت کے ٹکٹ بانٹ رہے ہوں گے اور یہ جماعتیں آپس میں ایک دوسرے سے بھی لڑ رہی ہوں گی۔

اسی لیے اللہ کے نبی ﷺ نے ایک علاقے میں ایک سے زائد افراد کی بیعت سے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا کہ پہلے کی بیعت کو برقرار رکھا جائے اور بیعت کے دوسرے مدعی کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس آپ نے ایک ہی علاقے میں الجماعۃ کے علاوہ ایک سے زائد محدود یا عارضی جماعتوں کے وجود اور ان کے نظم امارت سے منع نہیں کیا☆ جیسا کہ ایک حدیث

☆ الجماعۃ کے تحت محدود تنظیموں کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ تابع امیر یا گروہ ہو تو وہ الجماعۃ کے نظم کا ہی حصہ ہوگا اور اگر وہ محدود فکری اور رفاہی انجمنوں (NGOs) کی شکل ہوگی کہ اس کے لیے بنیادی اجازت اور نظم کی تشکیل بھی الجماعۃ کے نظم کے تابع ہوگی تو پھر بھی معاملہ وہی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں أميري کے الفاظ خلیفہ کے تابع امیر کا مفہوم پیش کر رہے ہیں۔ البتہ تمدنی ارتقا نے جو مختلف نظاموں کو دنیا کے سامنے رکھا ہے، اس میں سیاسی جماعتوں کا وجود شرعی طور پر غور طلب ہے جس کے لیے ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔ (محدث)

کے الفاظ ہیں:

من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن أطاع أميري فقد أطاعني ومن عصى أميري فقد عصاني (صحیح مسلم:۱۸۳۵)

''جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

غور طلب بات ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے زمانے میں دعوت وتبلیغ یا جہاد وقتال کے لیے مختلف لشکر بھیجتے یا کسی علاقے کی طرف کسی صحابی کو گورنر بنا کر بھیجتے تھے تو ان لشکروں کے اُمرا یا علاقوں کے گورنروں کی سمع و طاعت تو ہوتی تھی لیکن ان کی بیعت نہ ہوتی تھی کیونکہ بیعت تو صرف امام کی ہے اور امام ایک علاقے میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر ان گورنروں نے بیعت لینی بھی ہوتی تھی تو اپنے امام یا امیر المؤمنین کی بیعت لیتے تھے، جیسا کہ تاریخی آثار وکتب سے واضح ہوتا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

إذا خرج ثلثة في سفر فليؤمروا أحدهم (سنن ابوداؤد:۲۶۰۹)

''جب بھی تین افراد کسی سفر میں نکلیں تو اُنہیں چاہیے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔''

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہر حال میں جماعتی زندگی کو پسند کرتا ہے، اگر کسی جگہ مسلمانوں کا بڑا نظم امارت خود کنٹرول نہ کر رہا ہو مثلاً سفر کی حالت تو وہاں مسلمانوں کو عارضی نظم امارت قائم کر لینا چاہیے۔ اسی طرح کسی ذیلی مخصوص مقصد کے حصول کے لیے بھی جماعت بنائی جاسکتی ہے لیکن سفری یا کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے بنائی جانے والی عارضی جماعت کے امیر کی بیعت نہیں ہوگی، بیعت صرف الجماعة کے امیر کی ہوگی۔

اللہ کے رسول ﷺ کی بیعت

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی اُمت سے جتنی بھی بیعتیں لیں، وہ دو طرح کی ہیں: ایک بیعتِ نبوت جس کے مغالطے میں بیعتِ توبہ یا بیعتِ تزکیہ وارشاد کو ہمارے صوفیا نے پیری مریدی کی بیعت کا نام دے رکھا ہے اور دوسری بیعتِ امارت جس کے تابع بعض عسکری

تنظیمیں بیعتِ جہاد کو داخل کرتی ہیں۔ چونکہ بیعتِ جہاد بیعتِ امارت کا حصہ ہے، اس لیے یہ امیر المؤمنین کی اجازت سے مشروط ہے☆ اور بیعتِ توبہ اور بیعتِ اسلام تو بیعتِ نبوت کا حصہ ہیں۔ جب نبوت دائمی ہے تو بیعتِ توبہ یا بیعتِ اسلام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ بیعتِ نبوت صرف آپ ﷺ کا خاصہ تھا کیونکہ اس بیعت میں آپ کسی سے یہ وعدہ لیتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کر کے منکرات کو ترک کرتے ہوئے اپنا تزکیہ اور اصلاح کرے گا جیسا کہ قرآن میں عورتوں کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الممتحنۃ:۱۲)

''اے نبی ﷺ! جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں اس لیے آئیں تاکہ وہ آپ سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کوئی بہتان نہیں گھڑ لائیں گی اور معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو آپ ان سے بیعت کرلیں اور ان کے اللہ سے بخشش طلب کریں بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

چونکہ اللہ کے نبی ﷺ معصوم عن الخطاء ہیں، اس لیے آپ تو اپنے کسی اُمتی سے یہ وعدہ لے سکتے تھے کہ تم فلاں گناہ نہیں کرو گے، فلاں منکر کے قریب بھی نہیں پھٹکو گے اور میری اطاعت کرو گے لیکن ایک عام اُمتی مثلاً کوئی صوفی یا پیر صاحب معصوم نہیں ہوتے، ان سے گناہ کا صدور ممکن بھی ہے اور بہت دفعہ ہوتا بھی ہے تو جو خود گناہ گار ہو، اس کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے گناہ گار سے یہ وعدہ لے کہ تم گناہ نہیں کرو گے؟ اگر تو کوئی گناہ گار کسی دوسرے گناہ گار سے، گناہ کے چھوڑنے پر بیعت لے سکتا ہے تو پھر ہر مرید کو بھی پہلے اپنے پیر صاحب سے گناہ نہ کرنے کی بیعت لینی چاہیے جس پر کوئی بھی پیر صاحب کبھی بھی راضی نہ ہوں گے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جو شخص بھی مسلمانوں سے یہ بیعت لیتا ہے وہ نبی ﷺ

☆ امیر المؤمنین کے بغیر مختلف ٹولیوں کا جہاد کرنا ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جس کیلئے مستقل مضمون درکار ہے

کی نبوت میں نیابت کا داعی ہے اور ایسا دعویٰ جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آپؐ نے لوگوں سے دو بیعتیں لی تھیں: ایک بیعتِ امارت اور دوسری بیعتِ نبوت، پہلی بیعت تو صرف مسلمانوں کا خلیفہ ہی عام مسلمانوں سے لے سکتا ہے کیونکہ وہ آپؐ کی وفات کے بعد نظم امارت میں آپ ﷺ کا نائب ہوتا ہے اور آپؐ کے نائب یعنی خلیفہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی بیعتِ امارت لینا جائز نہیں ہے جبکہ دوسری بیعت لینا جس کو صوفیا نے بیعتِ توبہ یا ارشاد کا نام دے رکھا ہے، صرف اسی کے لیے جائز ہے جو خود اللہ کا نبیؐ ہو یا آپ ﷺ کی نبوت میں آپؐ کا نائب ہو۔ چونکہ آپؐ کی نبوت دائمی ہے لہٰذا امارت کی طرح نبوت میں آپؐ کی نیابت آگے اُمت میں منتقل نہ ہوئی۔ اس لیے بیعتِ توبہ یا بیعتِ ارشاد لینا کسی بھی اُمتی کے لیے جائز نہیں ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بیعت: بیعتِ نبوت اور امارت دونوں صرف نبی ﷺ کے لیے ہیں البتہ بیعتِ امارت نبیؐ کا خلیفہ (نائب) بھی لے سکتا ہے۔

بیعت لینے والوں کے دلائل کا جائزہ

اب ہم ان احادیث کی طرف آتے ہیں جن کو عام طور پر بعض حضرات بیعتِ امارت کی دلیل کے طور پر بیان کرتے ہیں اور ان روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کے نائب (خلیفہ) کے علاوہ کسی عارضی جماعت کے امیر کی بیعت بھی جائز ہے۔ خواہ وہ بیعت توبہ وارشاد ہو یا بیعت امارت۔

بعض اہل علم نے بیعتِ عقبہ☆ اُولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ اور ان سے قبل چھ افراد کی بیعت

☆ عَقَبَۃ پہاڑ کی گھاٹی یعنی تنگ پہاڑی گزرگاہ کو کہتے ہیں۔ مکہ سے منیٰ آتے جاتے ہوئے منیٰ کے مغربی کنارے پر ایک تنگ پہاڑی راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہی گزرگاہ عَقَبَہ کے نام سے مشہور ہے۔ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو جس جمرہ کو کنکری ماری جاتی ہے، وہ اسی گزرگاہ کے سرے پر واقع ہے، اس لیے اسے جمرہ عقبہ کہتے ہیں۔ اس جمرہ کا دوسرا نام 'جمرۂ کبریٰ' بھی ہے۔ باقی دو جمرے اس سے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ چونکہ منیٰ کا پورا میدان جہاں حجاج قیام کرتے ہیں، ان تینوں جمرات کے مشرق میں ہے۔ اس لیے ساری چہل پہل ادھر ہی رہتی تھی اور کنکریاں مارنے کے بعد اس طرف لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بیعت کے لیے اس گھاٹی کو منتخب کیا اور اسی مناسبت سے اس کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ اب پہاڑ کاٹ کر یہاں کشادہ سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔ تاہم ابھی تک ایک ذرہ نشانی کے طور پر موجود ہے جہاں سے سیڑھیاں نیچے اُترتی ہیں اور منیٰ سے 'شارٹ کٹ' لیتے ہوئے لوگ عزیزیہ شمالی اور جنوبی میں اُتر آتے ہیں۔

سے اس بات کی دلیل پکڑی ہے کہ ایک ایسی جماعت کے امیر کے لیے بھی عام مسلمانوں سے بیعت لینا جائز ہے جو کسی اسلامی ریاست میں خلافت یا امامت کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہو جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ میں اپنی امامت یا حکومت کے قیام سے پہلے مکہ مکرمہ میں عام مسلمانوں سے بیعت لیتے رہے یا پہلی مرتبہ یثرب (مدینہ منورہ) کے چھ افراد نے عقبہ کے مقام پر بیعت کی تھی جس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیعتِ اسلام تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ کے ان چھ افراد کی اس بیعت کو بیعت عقبہ اُولیٰ شمار نہیں کرتے بلکہ اگلے سال ۱۲/افراد کی بیعت کو بیعتِ عقبہ اولیٰ کہتے ہیں جس کے بعد ۷۳/افراد کی بیعت کو عقبہ ثانیہ سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں بیعتیں نبیؐ کے مدینہ منورہ کی سیادت کی تمہید تھیں۔ اس لیے گویا ان دونوں بیعتوں کی بنا پر آپ کو اِمام بِالْقُوَّۃ تسلیم کرلیا گیا۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ جس کا تذکرہ اکثر احادیث میں ملتا ہے، وہ نبوت کے ساتھ امارت کی بیعت بھی ہے۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ و ثانیہ امارت ہی کی بیعت تھیں جو کہ آپ نے مسلمانوں کے امام ہونے کی حیثیت سے لی تھی اور ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے امیر یا خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرے اور امارتِ شرعیہ کے قیام کے لیے کوشاں ہو تو وہ اپنی جماعت کے اراکین سے بیعت لے سکتا ہے۔ اس لیے بیعت صرف ایسے فرد کی کی جائے گی جس کا سیاسی اقتدار کسی محدود یا غیر محدود علاقے میں بالفعل یا بالقوۃ قائم ہو جائے

☆ عَقَبَۃ پہاڑ کی گھاٹی یعنی تنگ پہاڑی گزرگاہ کو کہتے ہیں۔ مکہ سے منیٰ آتے جاتے ہوئے منیٰ کے مغربی کنارے پر ایک تنگ پہاڑی راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہی گزرگاہ عَقَبَہ کے نام سے مشہور ہے۔ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو جس جمرہ کو کنکری ماری جاتی ہے، وہ اسی گزرگاہ کے سرے پر واقع ہے، اس لیے اسے جمرہ عقبہ کہتے ہیں۔ اس جمرہ کا دوسرا نام 'جمرۂ کبریٰ' بھی ہے۔ باقی دو جمرے اس سے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ چونکہ منیٰ کا پورا میدان جہاں حجاج قیام کرتے ہیں، ان تینوں جمرات کے مشرق میں ہے۔ اس لیے ساری چہل پہل ادھر ہی رہتی تھی اور کنکریاں مارنے کے بعد اس طرف لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بیعت کے لیے اس گھاٹی کو منتخب کیا اور اسی مناسبت سے اس کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ اب پہاڑ کاٹ کر یہاں کشادہ سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔ تاہم ابھی تک ایک ذرّہ نشانی کے طور پر موجود ہے جہاں سے سیڑھیاں نیچے اُترتی ہیں اور منیٰ سے 'شارٹ کٹ' لیتے ہوئے لوگ عزیزیہ شمالی اور جنوبی میں اُتر آتے ہیں۔

اور بالقوۃ اقتدار قائم ہونے کی مثال ہجرت سے قبل آپ کی بیعتِ عقبہ اولیٰ یا عقبہ ثانیہ ہے۔

بعض اہل علم کو بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ سے یہ مغالطہ لگا کہ کسی ایسی محدود اور عارضی جماعت کا امیر بھی مسلمانوں سے بیعت لے سکتا ہے جو امارتِ شرعیہ یا امامتِ کبریٰ کے قیام کے لیے بنائی گئی ہو۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ بعض روایات میں الفاظ ہیں:

فرحل إليه منا سبعون رجلا فوعدناه بيعة العقبة فقلنا: على ما نبايعك؟ فقال: على السمع و الطاعة في النشاط و الكسل وعلى النفقة في العسر و اليسر وعلى الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وعلى أن تنصروني إذا قدمت عليكم يثرب فتمنعوني مما تمنعون منه أنفسكم وأزواجكم وأبنائكم ولكم الجنة (فتح الباری مع صحیح بخاری:۲۲۲/۱۱)

''پس (مدینہ سے) اللہ کے رسول ﷺ کی طرف تقریباً ستر افراد نے سفر کیا پس ہم نے اللہ کے نبی ﷺ سے بیعتِ عقبہ کی۔ ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا ہم کس چیز پر آپ سے بیعت کریں تو آپ نے فرمایا: ہر حال میں سمع و طاعت پر، چاہے دل آمادہ ہو یا نہ ہو اور اللہ کے رستے میں خرچ کرنے پر بیعت کرو چاہے آسانی ہو یا تنگی ہو اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر بیعت کرو اور اس بات پر کہ جب میں یثرب آؤں گا تو تم میری مدد کرو گے اور تم میرا اس طرح دفاع کرو گے جس طرح تم اپنی جانوں یا بیوی بچوں کا دفاع کرتے ہو اور تمہارے لیے اس کے بدلے میں جنت ہے۔

یہ روایت اس مسئلے میں صریح ہے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ مدینہ میں قائم ہونے والی ریاست کے امیر کی حیثیت سے تھی۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی خطہ ارضی میں اپنی امارت میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہو اور اس کے لیے لوگوں سے تعاون حاصل کر رہا ہو تو وہ اپنے متعاونین سے بیعت بھی لے سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ الجماعۃ سے مراد اُمتِ مسلمہ ہے یا کسی خاص علاقے میں مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی نظم؟ احادیث میں ہر مسلمان پر الجماعۃ کے التزام کو لازم قرار دیا گیا ہے اور ایک خاص علاقے میں ایک الجماعۃ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری الجماعۃ

بنانا شرعاً جائز نہیں ہے، بالفرض اگر محدود مقاصد کے حصول کی خاطر کوئی محدود جماعت یا انجمن بنائی جاسکتی ہے اور اس محدود جماعت یا انجمن کا نظم الجماعۃ کے نظم کی مانند بھی ہوسکتا ہے یا اس کے علاوہ بھی کوئی ایسا نظم اختیار کیا جا سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی نہ ہو لیکن بیعت جو اللہ تعالیٰ سے ایک سودے یا جان و مال کے معاہدے کا نام ہے وہ الجماعۃ کے امیر کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں الجماعۃ کے امیر آپ بذاتِ خود تھے لہٰذا بیعت بھی آپ کی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد الجماعۃ کا امیر مسلمانوں کا خلیفہ ہوتا تھا، لہٰذا بیعت اس خلیفہ کی ہوتی ہے اور اگر یہ خلفا مختلف علاقوں میں ایک سے زائد ہوں جیسا کہ بنو عباس کے دور میں اَندلس میں بنو اُمیہ کی حکومت تھی تو ہر خلیفہ کی اس علاقے کے لوگوں پر بیعت واجب ہے۔ اور اگر ایک ہی علاقے میں ایک سے زائد افراد خلیفہ ہونے کا دعویٰ کریں تو پہلے کی خلافت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے بیعت کی جائے اور متاخر خلیفہ کو جو مسلمانوں سے اپنی خلافت پر بیعت لے رہا ہو، قتل کر دیا جائے گا۔

اگر صورتِ حال یہ ہو کہ کسی علاقے میں مسلمانوں پر کفار کی حکومت ہو تو اگر کوئی مسلمان کافر کی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی امارت قائم کرنے کے لیے جماعت بنائے تو ایسی جماعت کا امیر بھی اپنی جماعت کے اراکین سے بیعت لے سکتا ہے جیسا کہ سید احمد بریلوی شہیدؒ نے بیعت لی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کا کوئی حکمران 'کفر بواح' کا مرتکب ہو یا تارکِ صلاۃ ہو تو کوئی مسلمان اگر ایسے حکمران کی امامت ختم کرنے اور اپنی امامت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو تو ایسا شخص بھی اپنی جماعت کے افراد سے بیعت لے سکتا ہے۔ اس انفرادی امامت پر اس اجتماعی امامت (ریاست) کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جس کا آئین و دستور اسلامی ہو، لیکن اگر کوئی شخص امارتِ شرعیہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہا ہو اور اس کے لیے اس نے کوئی جماعت بنائی ہو اور وہ خود امامت کا مدعی نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے عام مسلمانوں سے بیعت لینا جائز نہیں ہے کیونکہ بیعتِ امارت و جہاد یا تو الجماعۃ کے امام کے لیے ہے یا اس کے لیے جو الجماعۃ کی امامت کے حقدار ہونے کا مدعی ہو جیسا کہ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا معاملہ تھا۔ واللہ أعلم بالصواب